eISSN: 2789-6331
pISSN:2789-4169

CC BY
OPEN ACCESS

ڈاکٹر بلقیس اختر
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد
پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال
پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Bilqees Akhtar
PhD Scholar Urdu, Government College Women University, Faisalabad
Professor Dr. Tahira Iqbal
Professor, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad

اسد محمد خاں کے افسانوں میں شناخت کا المیہ

THE TRAGEDY OF IDENTITY IN THE FICTIONS OF ASAD MUHAMMAD KHAN

ABSTRACT

"This research analyzes the fiction of Asad Muhammad Khan which depicts the loss of identity. Identification to cast and creed is very essential for development of human personality but most of time people in our society become victim of identity crisis even are not given any name by their fathers. These people fall a prey to different psychological, social, and economic problems. Asad Muhammad Khan presents such characters in his work as Alli Gujar, Babbar Yar Khan and Mai Dada. So, this research describes the deprivations of these identitiless people in all social, moral and cultural dilemmas."

KEYWORDS

Loss of identity, Identity crises, psychological, social problems, deprivations, moral and cultural dilemmas

حسب نسب کے حوالے سے شناخت یا پہچان انسان کی شخصیت کی نشوونما کے لیے انتہائی ضروری ہے، یعنی وہ کس کی اولاد ہے؟ کس خاندان یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ ہمارا معاشرہ شناخت کے بغیر انسان کو قبول نہیں کرتا۔ ایسے لوگ جن کے والد انھیں اپنا نام نہیں دیتے۔ وہ متعدد معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل اور محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلے پہل وہ حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنی شناخت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جب اس میں ناکام ہو جائیں تو مختلف جرائم کی طرف بھی مائل ہو سکتے ہیں۔

اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں ایسے بے شناخت لوگوں کی محرومیوں کو بھی موضوع بناتے ہیں جن کے والد اور خاندان والے انھیں اپنے نام اور وراثت سے محروم رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی بے نکاحی عورتوں کی اولاد ہوتے ہیں۔ وہ اسّی فیصد تک اپنے فطری

باپ سے مماثلت بھی رکھتے تھے لیکن گھر میں ملازموں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ مصنف نے اپنے خاندان اور علاقے میں ایسے لوگوں کو دیکھا تھا۔ اس لیے انھیں اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اسد محمد خاں کو ایسے لوگوں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ "گھس بیٹھیا" کا کردار "ببر یار خاں" ایسے ہی لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

ببر یار خاں کا باپ اس کے دادا کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا اور ببر یار خاں اپنی والدہ کا نکاح نامہ اور اشرافیہ حسب نسب پیش نہیں کر سکا تھا، چنانچہ خاندان والوں نے اس کو ترکے میں سے کوئی حصہ نہ دیا، جب کہ اس کے تایوں اور چچاؤں کی مضبوط ننھیال والی اولادیں سرج کی شیروانیاں پہنے اپنی ماؤں کے نکاح نامے موم جامے میں باندھے، مضبوطی سے اپنے ترکے کے پیندے پر جمے، روٹیاں چکنی کر کے کھا رہے تھے۔ وہ کسی گھس بیٹھیے لاولد حرام زادے کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔

دس بارہ سال کی عمر سے ہی ببر یار خاں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنا شروع کر دیتا ہے لیکن والد کا نام اور سایہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مالک معمولی غلطیوں کی بھی جان لیوا سزائیں دیتے۔ اپنے گناہ بھی اس کے کھاتے میں ڈال کر اس کا یہ حال کیا جاتا۔

> "رحمت اللہ ٹھیکے دار نے سکون کا سانس لیا اور گاؤں والوں کی مدد سے ببر یار خاں کو پکڑ کر آم کے تنے سے باندھ دیا، پھر بیدوں سے وہ مار لگائی کہ ٹھاکر تک کو سفارش کرنی پڑی کہ مر جائے گا حرامی۔۔۔ اب کھول دو سسرے مدرچ کو۔ اور سُسرے مدرچ کو کھول کر سرکاری سڑک پر پھینکوا دیا گیا۔۔۔ ببر یار خاں زخمی تو بہت ہوا تھا۔ شاید اس کے گردوں پر چوٹ پڑی تھی کچھ دن اسے پیشاب کے رستے خون آتا رہا۔"(۱)

والد کے نام اور سائے سے محرومی کی وجہ سے ببر یار خاں کو سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ببر یار خاں زمینداروں کی سختیوں سے تنگ آ کر پہاڑ پر جھونپڑی ڈال کر رہنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ خود کو زندہ رکھنے کے لیے چوری کرتا ہے، عورتوں کی دلالی کرتا ہے، تیس پینتیس سال کی عمر میں ہی آتشک کا مریض ہو کر اُدھیڑ عمر آدمی لگنے لگتا ہے۔ زندگی کی تیرہ دستیوں سے تنگ آ کر نشہ بھی شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنے خاندان والوں سے اپنی کسمپرسیوں اور زیادتیوں کا صرف اتنا ہی بدلہ لے سکا:

> "ایک رات وہ جیسے تیسے شہر کے وسط میں پہنچا اور ایزد یار خاں کی حویلی تک آ گیا اور حویلی کے بلند دروازے کے سامنے، جہاں اس کے تایوں، چچوں کی اولادوں کے موٹر آ کر رُکتے ہوں گے، عین اس جگہ، وہ حوائج ضروری سے فارغ ہوا۔۔۔ پھر طہارت کیے بغیر مزے سے چلا آیا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟"(۲)

یہ ایک کمزور معاشی حیثیت کے بریار خاں کا انتقام تھا، پھر اُسے اپنے جیسا ایک دھتکارا ہوا ہندو ڈلیچن لکھیرا مل جاتا ہے، جو صرف اپنی چتکبری بیماری کی وجہ سے کوڑھی قرار دے کر مندر تک سے نکال دیا جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان سب اُسے دُر دُر کرتے تھے اور دُور ہی سے پیسے پھینک کر گویا اپنی جان بچا لیتے تھے، اِس طرح ڈلیچن کو مانگنے میں بھی زیادہ دِقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں قبرستان کی کھولی میں اکٹھے رہنا شروع کر دیتے ہیں اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں الگ الگ مذاہب سے ہیں لیکن انسانیت کے رِشتے میں منسلک ہو کر ایک وسرے کی خبر گیری کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں خوش ایک دوسرے کے لیے دُعا گو تھے۔ ان محروموں کو زیادہ چاہیے بھی نہیں تھا لیکن شہر پر ایک مصیبت ٹوٹ پڑی اور دھویں کا سفید دریا روتے، کھانستے مرتے ہوئے شہر پر بہنے لگا۔ پانچ لاکھ آدمیوں نے اندھے شہر کی چیختی ہوئی سڑکوں پر دوڑنا شروع کر دیا۔ شہر کی تباہی کا یہ واقعہ حقیقت میں پیش آیا تھا، جسے عقیلہ اسماعیل نے اِس طرح بیان کیا ہے:

> ''گھس بیٹھیا، میں مصنف نے بھوپال میں یونین کاربائیڈ کمپنی کے پلانٹ سے مہلک گیس خارج ہونے کے المیے کو پس منظر کے طور پر اِستعمال کیا ہے۔ یہ حادثہ ۳دسمبر ۱۹۸۴ء کو پیش آیا تھا۔۔۔ اسد محمد خاں کے لیے واقعہ دُکھ کی ایسی جانکاری تھی جو دوسروں کے واسطے سے حاصل ہوئی تھی۔۔۔ ان کا آبائی گھر، جو شہر کے وسط میں تھا، نہیں بچ سکا، موت نے سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا۔ اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں کہ کس کی چِتا جلائی گئی اور کس کس کو بڑی مشترکہ قبروں میں دفن کیا گیا۔''(۳)

اسی واقعہ کو اس افسانے میں دُہرایا گیا ہے۔ لوگ گیس کے اخراج سے مرتے جا رہے ہیں۔ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ یہ دونوں دھتکارے ہوئے اور معاشرتی اِستحصال کا شکار لوگ اِس وقت بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

بریار خاں کی آنکھوں کی بینائی بھی رُخصت ہو چکی تھی۔ ڈلیچن اسے بینچ پر لٹا دیتا ہے۔ دونوں موت کے قریب ہیں اور ایک دوسرے کے لیے دُعائیں کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی سورگ (جنت) میں بھی اکٹھے رہیں۔ بریار خاں کی دُعا قبول ہوتی ہے اور ڈلیچن لکھیرا کلمہ شہادت پڑھ لیتا ہے، پھر دو گھس بیٹھیے، حرام خور بیج، ایک دوسرے کی سنگت میں اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ افسانے میں اسد، مذہب تہذیب، ثقافت اور انسانیت کی مماثلتوں اور اِشتراکات کو بھی تلاش کرتے ہیں اور اس اُجڑتی تہذیب کو پھر ملانے میں کوشاں ہیں۔

''گھس بیٹھیا'' لاولد بریار خاں کی محرومیوں کے ساتھ اِس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ، کردار کیگر اوٹ اور اخلاقی پستی کا شکار ہو چکا ہے۔ یہاں انسانی حقوق قصہ پارینہ بنتے جا رہے ہیں اور صحیح انسانی اقدار ہمیں بعض اوقات پسے ہوئے طبقے میں ملتی ہیں، جو محض انسانیت کی خاطر ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ افسانہ حقیقت پسندانہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ کہانی میں اقدار کا حوالہ تضاد کی تکنیک

کی مدد سے جگہ جگہ موجود ہے۔ دلیجن لکھیرا اور ببر یار خان دونوں کرداروں کی مناسبت سے تضاد پیدا کیا گیا ہے۔

اسد محمد خان نے اپنے ایک اور افسانے "اَلّی گجر کی آخری کہانی" میں "اَلّی گجر" کے کردار کی آڑ میں بھی ایسے بچوں کی مالی، معاشی اور نفسیاتی محرومیوں کی عکاسی کی ہے جن کے والد انھیں اپنے نام، پیار، محبت اور ترکے سے محروم رکھتے ہیں کیونکہ معاشرے اور گھر والوں کے سامنے اپنی نیک نامی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے وہ اپنے ہی بچوں کو اپنانے سے اِنکاری ہوتے ہیں۔

"اَلّی گجر" بھی ایسا ہی مظلوم کردار ہے، جس کا والد چوئی صاب اسے مزارعے کا بیٹا کہہ کر متعارف کرواتا ہے، لیکن لوگ ایسی بے سروپا باتوں پر یقین نہیں کیا کرتے۔

> "اصل میں سب جانتے تھے۔ پندرہ گاؤں اِدھر، پندرہ گاؤں ادھر، سب جانتے تھے کہ اَلّی چوئی صاب کا بیٹا ہے۔ کسی رحمتی کے پیٹ سے۔ بس یہ ہے کہ وہ اسے بیٹا نہیں مانتے۔"(۴)

باپ الّی کو بیٹا ماننے سے اَنکاری تھا لیکن سچائی سب پر عیاں تھے۔ اس کی ماں مجبور اور بے بس عورت تھی جو نیم پاگل تھی۔ بول اور سن بھی نہیں سکتی تھی اور فسادات میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اَلّی کو چوئی صاب اپنے ساتھ حویلی لے آتا ہے اور مزارعے کے بیٹے کی حیثیت سے حویلی میں پلنے لگتا ہے۔ اَلّی اپنی وقت گزاری اور دوسروں سے توجہ حاصل کرنے کے لیے خیالی کہانیاں بنانے اور سنانے لگتا ہے، لیکن اِس بدنصیب کی کہانیاں بھی طاقتوروں کو گوارا نہیں ہوتیں۔ لہٰذا وہ اَلّی کی شامت کا سبب بن جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ الّی کی کہانیاں اور اس کے کردار بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کی کہانیوں میں ریشماں اس کی بیوی اور اس کا بیٹا آجاتا ہے۔ چوئی صاب کے اصل بیٹے کی شادی ہوتی ہے تو اتفاق سے اس کی بیوی کا نام ریشماں ہوتا ہے۔ اس مماثلت نے اَلّی کو ہسپتال پہنچا دیا۔ مار مار کر زمینوں اور مویشیوں کے مالک گرم خون والے چوئی لوگوں نے اَلّی کی حالت خراب کر دی۔

اَلّی کو ہسپتال سے چوئی صاب ڈی ایس پی کے دھمکانے پر گھر واپس لے آئے اور پاؤں میں زنجیروں ڈال دی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اَلّی کو سیندور کھلا دو۔ اس کی آواز بیٹھ جائے گی تو کہانیاں بھی نہیں سنا سکے گا۔ اَلّی یہ سب سہتا آہستہ آہستہ تہپا گل پن اور بڑھاپے کی دہلیز پار کر لیتا ہے۔ اسدؔ نے سادہ بیانیے میں الّی گجر جیسے بے شناخت لوگوں کی محرومیوں کی عکاسی کی ہے۔ اسد محمد خاں اپنے افسانوں میں جذبات اور احساسات کو ملال کی آنچ میں پیش کرتے ہیں اور ببر یار خاں، ڈلیجن لکھیر اور الّی گجر جیسے لوگوں کی محرومیوں کو دلی کرب اور دُکھ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

یاسمین حمید لکھتی ہیں:

’’اسد محمد خاں کی والہانہ محبت کا ہدف وہ سب کم وسیلہ لوگ ہیں جنھیں ہمارے اشراف زیادہ سے زیادہ ہکلانے اور گڑ گڑانے کی اجازت دیتے ہیں یا پھر پاگل ہو جانے کی۔‘‘(۵)

اسد محمد خاں ایک حساس دل رکھنے والے افسانہ نگار ہیں جب وہ الّی گجر جیسے بے یارومددگار لوگوں پر ظلم برداشت نہیں کرپاتے تو ظالموں، استحصالیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا الگ طریقہ نکالتے ہیں۔ وہ یہ کہ اُن کے ظلم واستحصال کو اپنے افسانوں کے ذریعے بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اسد محمد خاں اپنے کرداروں پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔ یہ کردار پرچھائیاں نہیں ہیں بلکہ معاشرے کے زندہ لوگ ہیں مگر انھیں خود کو پورا دیکھنے کا ہوش یا توفیق نہیں ہوتی۔

’’مئی دادا‘‘ ایک کرداری افسانہ ہے جو اسد محمد خاں کے افسانوی مجموعے ’’کھڑکی بھر آسمان‘‘ میں شامِل ہے۔ مصنف بطور واحد متکلم کہانی میں موجود رہتا ہے۔ مئی دادا ایک پٹھان خاندان کا جدی پشتی ملازم ہے، جس کی شناخت مشتبہ ہے، جس کے تین نام تھے۔ مجیتا، مجید اور مئی دادا، خود مئی دادا کا بیان تھا ان کا نام ’’ابدل مزید کھاں ایسپ جئ (عبدالمجید خاں یوسف زئی) ہے۔ اس کے بارے میں دھوبیوں نے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ وہ ذات کا ہندو تیلی ہے، لیکن مئی دادا خود کو یوسف زئی کہلانے پر مصر تھا۔

’’مئی دادا‘‘ کو اپنے مالک خاندان سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کا شجرۂ نسب انھیں ازبر تھا جسے مصنف نے ان کی مخصوص زبان میں ’’ساکھ سجر‘‘ لکھا ہے۔ مئی دادا کہتے تھے :

’’میں تیرے کٹمب قبیلے کے ’’ساکھ سجر‘‘ کا ماشٹر ہوں اور یہ کہ ’’ایسا چاروں کھونٹ ساکھ سجر‘‘ میں نے کہیں اور نہیں دیکھا‘‘(۶)

مئی دادا فخر سے متکلم کے قبیلے کے شجرۂ نسب کو دوسروں سے بیان کرتے اور بچوں کو زبانی یاد بھی کرواتے۔ یہ اپنے مالکوں کی مضبوط خاندانی حیثیت کے دل وجان سے معترف تھے۔ خود اپنا شجرہ بھی بنا رکھا تھا جو کسی خاتون کے اصرار پر اِس طرح بتاتے تھے۔

’’’’ ٓ میسہ مر ابن ٓ میسہ مر‘ ابنے ٓ مسہ یر، ابنے ابدل مزید کھاں ’ایسپ جئ‘ اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔‘‘(۷)

مئی دادا کا قہقہہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خاندانی شناخت سے محروم ہیں لیکن انھوں نے اپنے مالکوں کی شناخت کا پردہ اوڑھا ہوا تھا اور اِس طرح مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ پٹھان لوگ اپنے شجرہ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اسی کے زیرِ اثر وہ بھی مالکوں کا شجرہ زبانی یاد کیے بیٹھے تھے اور اسی پر فخر کر کے خوش ہو لیتے تھے۔ مذکورہ افسانے میں ان کے تین نام بھی غالباً تین مذاہب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مصنف

ایک کردار کے اندر تینوں مذاہب کو یکجا کر کے انسان دوستی کا پرچار کرتا ہے۔ ان کا 'مجیتا' نام غالباً سکھ ازم کی، مجید اسلام کی اور مئی دادا ہندوازم کی ترجمانی کرتا ہے۔

عظمیٰ طارق لکھتی ہیں:

"افسانہ نگار نے برصغیر میں مختلف تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا۔ ان کے مابین ہونے والے اختلاط کا جائزہ لیا اور انسان کے باطنی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔"(۸)

مئی دادا کا کردار انسانی نفسیات کی وہ گرہ ہے جو مختلف تہذیبوں کے درمیان جنم لینے والے انسان کی شخصیت میں پیدا ہوئی۔ مئی دادا گاہے بگاہے اپنے اصل سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور خود کو پٹھان قوم میں مدغم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں ان کے کارناموں اور آباؤاجداد کی روایات سے بہت محبت تھی۔ پٹھان لوگ صاحب سیف تھے۔ یہ جنگجو لوگ مختلف مہمات میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ اس لیے عام حالات میں بھی "قتل" ان کے نزدیک ایک ایسا فعل تھا، جو رُعب و دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا لیکن متکلم کے خاندان کا رجحان تعلیم حاصل کرنے کی طرف ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے بزرگوں کی قتل و غارت کی روایات کو اپنانے کی بجائے عام لوگوں کی طرح پُرامن زندگی گزارنے کے عادی ہو رہے تھے۔ مئی دادا نے چونکہ ان کے بزرگوں کے جنگجویانہ کارنامے خود مشاہدہ کیے تھے۔ اس لیے وہ جدید تعلیم اور پٹھان بچوں کے موجودہ رویوں پر افسوس کرتے تھے۔

"اکثر بڑے تاسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا، جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے، اس خاندان کے لوگوں نے کوئی "قتل" ہی نہیں کیا۔"(۹)

وہ ایسے افعال کو پٹھانوں کے قاعدے گردانتے تھے اور اپنے مالکوں کی صحبت کی وجہ سے وہ بھی ہتھیاروں سے بہتمحبت کرتے تھے۔ انھوں نے ایک "تپنچا" بھی رکھا ہوتا تھا جو بقول اُن کے کسی "بھان کے گھوڑے" نے چُرا لیا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے ایک "زنبیہ" بنوایا، جس کی نیام پر متکلم کی اماں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھوایا یوں اپنے مرحوم تپنچے کے بعد ایک عدد اصل زنبیے کے مالک بن گئے۔ مئی دادا اپنے مالکوں کے ہتھیاروں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ انھیں حفاظت سے رکھتے ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑتے، جب حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہتھیار مال خانے میں جمع کروا دیئے جائیں۔ یہ خبر انھیں بہت افسردہ کر گئی۔ بحر حال مجبوراً ہتھیار جمع کروانے مال خانے پہنچے لیکن وہاں جب ایک حوالدار سکھیا رام (جو ذات کا تیلی تھا) نے خاندان کے ایک بڑے نواب کے ہتھیار سے پنسل چھیلنا شروع کر دیتا ہے تو مئی دادا اُس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں:

"مئی دادا نے "ازل گر پھتا"، "یابھان کے "کہہ کر جو ایک زناٹے کا تھپڑ مارا تو حوالدار سکھیا کی بیڑی اور پنسل دور جا پڑی، پھر انھوں نے اس تیلی کے پودے کو اِطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے۔۔۔ تیری ترکاری کاٹنے والی چھری نہیں اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے۔ اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"(۱۰)

مئی دادا، حوالدار کی ایک ذرا سی گستاخی پر اپنے مالک خاندان کی ناموس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں، کیونکہ ثقافتی تفوق ہمیشہ حاکم طبقے کو حاصل رہا ہے۔ محکوم مرعوبیت میں اس ثقافت و تہذیب کو اپناتا ہے۔ مئی دادا نے بھی پٹھانوں کی تہذیب و ثقافت کو اپنا رکھا تھا۔ اس لیے ان کے اندر بھی وہی طنطنہ اور تفاخر دکھائی دیتا ہے۔

مذکورہ افسانہ مصنف کے خاندان میں بزرگوں کے احترام کی روایت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ چاہے وہ بزرگ کام کرنے والے ملازم ہی کیوں نہ ہوں۔ پٹھانوں کی اپنائیت خلوص اور وفا "مئی دادا" کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک سے ظاہر ہوتی ہے۔

مئی دادا کا کردار طبقاتی معاشرے کی پیداوار ہے، جس نے انسان کی حدود و قیود کا تعین اپنے مفاد کے لیے کر رکھا ہے۔ مئی دادا نے شاید افسانے کے منظر نامے پر معاشرے کا وہ کلنک چھپانے کی کوشش کی ہے جو سماج نے ذات، برادری اور مذہب کے نام پر لگایا تھا اور ایک لمحے میں اسے حقیر بنا دیا گیا۔ مئی دادا تاحیات اپنی پہچان کو چھپاتے رہے۔ آخر میں جب مئی دادا بیمار تھے اور غشی کی حالت میں ان کا یہ راز افشا ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ اتفاقاً متکلم کو یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

"وہ غشی کی حالت میں تھے۔ میں انھیں ڈھکا کھلا دیکھ لیا۔۔۔ میں نے دیکھا کہ انکی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں"(۱۱)

متکلم کے لیے بھی یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا، لیکن جب مئی دادا کو اس حقیقت کی خبر ہوتی ہے۔ تو ان کی حالت اس طرح ہوتی ہے:

"بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے۔۔۔ لڑکے کیا سوچیں گے۔ پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی "ٹھی ی ی ی ک ہے۔ تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔"(۱۲)

یہ پیراگراف مئی دادا کی کرب ناک حالت کی عکاسی کرتا ہے کہ جس پہچان کو وہ ساری عمر بھر چھپاتے رہے وہ ان کی بیماری کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ سوائے رونے کے وہ اور کیا کر سکتے تھے۔ بالآخر اپنی حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں لیکن آخر میں متکلم کے والد کا بیان مئی داد کی حیثیت کو مستحکم کر گیا۔"

"وہ کوئی بھی تھا، تمہیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تم دادوں پر دادوں کی طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ۔۔۔ سمجھے جاؤ اب کھیلو۔ پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹ پڑے اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے؟ کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟"(۱۳)

متکلم کے والد کا بیان، مئی دادا کی محرومیت کو ختم کر کے انھیں عزت و محبت سے مالامال کر دیتا ہے اور یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ محبت، خلوص اور اپنائیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مئی داد اپنے کردار، خدمت، لگاؤ کی بدولت ان کے لیے قابلِ محبت و احترام تھے۔ مجموی طور پر "مئی دادا" برصغیر کے اس طبقے کی کہانی محسوس ہوتی ہے جو مختلف تہذیبوں کے درمیان کھلونا بن گیا۔ اس کا ذاتی تشخص ماند ہوا تو اس طبقے نے حکمرانوں کے کلچر میں خود کو ڈھال لیا لیکن زمانی افراط و تفریط نے اسے ہمیشہ کم حیثیت کے زمرے میں رکھا۔

اسد محمد خاں نے اپنے مذکورہ تینوں کرداروں کے ذریعے اس بے رحمانہ معاشرتی سچائی کو بے نقاب کیا ہے جس کے تحت امیر خاندانوں کے کچھ چشموں چراغ غریب عورتوں کی عزت سے تو کھیلتے ہیں لیکن انہیں اور ان کے بچوں کو اپنانے سے انکاری ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ بچے متعدد معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل و محرومیوں کا شکار ہو کر کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام خوشیوں اور حقوق سے محروم رہتے ہیں جو معاشرتی شناخت رکھنے والے افراد کو حاصل ہوتی ہے۔ اس معاشرتی المیہ کو اسد محمد خاں نے اپنے مذکورہ تینوں کرداروں کے ے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسد محمد خاں، گھس بیٹھیا، مشمولہ: جو کہانیاں لکھیں، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۳۔ عقیلہ اسماعیل، جمالیاتی ذوق کا امین، مترجم: رضی مجتبیٰ، مشمولہ: چہار سُو، مدیر اعلیٰ: گلزار جاوید، شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۸ء، ص ۲۶

۴۔ اسد محمد خاں، الّی گجر کی کہانی، مشمولہ: جو کہانیاں لکھیں، ص ۸۷۰

۵۔ یاسمین حمید، نیا اُردو افسانہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۶

۶۔ اسد محمد خاں، مئی داد، کھڑکی بھر آسماں، مشمولہ: جو کہانیاں لکھیں، ص ۵۳

۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۸۔ عظمیٰ طارق، مئی دادا۔۔۔ تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ: کہانی گھر، مرتب زاہد حسین، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۶

۹۔ اسد محمد خاں، مئی داد، ص ۵۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۳۔ ایضاً

References

1. Asad Muhammad Khan, Gus Bethiya, Mashmoola: Jo Kahaniyan Likhen, Karachi: Academy Bazyaft, 2006, P.116
2. Ibid, P.118
3. Aqeela Ismail, Jamaliyati Zauq ka Ameen, Translator: Razi Mujtaba, Mashmoola: Chahar Soo, Mudir Aala: Ghulzar Jawed, Shumara January February, 2008, P.26
4. Asad Muhammad Khan, Illi Gujjar Ki Kahani, Mashmoola: Jo Kahaniyan Likhen, P.870
5. Yasmeen Hameed, Naya Urdu Afsana, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2014, P.166
6. Asad Muhammad Khan, Mi Dad Khirki Bhar Asman, Mashmoola: Jo Kahaniyan Likhen, P.53
7. Ibid, P.55
8. Uzma Tariq, Mi Dad… Taziyati Mutaliya, Mashmoola: Kahani Ghar, Muratib: Zahid Hussain, Lahore: Sanjh Publications, October November 2014, P.206
9. Asad Muhammad Khan, Mi Dad, P.53
10. Ibid, P.60
11. Ibid, P.63
12. Ibid, P.65
13. Ibid